

تفہیم القرآن

الصافات

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ الصافات سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول | مضافین اور طرز کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورت غالباً مکی دور کے وسط میں، بلکہ شاید اس دورِ متوسط کے بھی آخری زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔ اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ پس منظر میں مخالفت پوری شدت کے ساتھ رہا ہے اور نبی و اصحاب نبی کو نہایت دل شکن حالات سے سابقہ درپیش ہے۔

موضوع و مضمون | اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید و آخرت کا جواب جس شخص اور استہزاء کے ساتھ دیا جا رہا تھا، اور آپ کے دعوائے رسالت کو تسلیم کرنے سے جس شدت کے ساتھ انکار کیا جا رہا تھا، اُس پر کفار مکہ کو نہایت پر زور طریقہ سے تنبیہ کی گئی ہے اور آخر میں انہیں صاف صاف خبردار کر دیا گیا ہے کہ عنقریب یہی پیغمبر جس کا تم مذاق اڑا رہے ہو، تمہارے دیکھتے دیکھتے تم پر غالب آجائے گا، اور تم اللہ کے لشکر کو خود اپنے گھر کے صحن میں اترادو پاؤ گے (آیات نمبر ۱ تا ۱۷۹) یہ نوٹس اُس زمانے میں دیا گیا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے آثار و ردور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ مسلمان (جن کو ان آیات میں اللہ کا لشکر کہا گیا ہے) بُری طرح علم و حکم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان کی تین چوتھائی تعداد ملک چھوڑ کر نکل گئی تھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بمشکل ۴۰-۵۰ صحابہ مکہ میں رہ گئے تھے اور انتہائی بے بسی کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے۔ ان حالات میں ظاہر اسباب کو

دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ غلبہ آخر کار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی مٹھی بھرے سرور سامان جماعت کو نصیب ہو گا۔ بلکہ دیکھنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ قریب بکتے کی گھائیوں ہی میں دفن ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن ۱۵-۱۶ سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آگیا جس سے کفار کو خبردار کیا گیا تھا۔

تنبیہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں تفہیم اور ترغیب کا حق بھی پورا توازن کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ توحید اور آخرت کے عقیدے کی صحت پر مختصر اور دلنشین دلائل دیئے ہیں، مشرکین کے عقائد پر تنقید کر کے بتایا ہے کہ وہ کیسی لغو باتوں پر ایمان لائے بیٹھے ہیں۔ ان گراہیوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان و عمل صالح کے نتائج کس قدر شاندار ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں کھلی تاریخ کی مثالیں دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاء کے ساتھ اودان کی قوموں کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے، کس کس طرح اس نے اپنے وفادار بندوں کو نوازنا شروع کیا اور کس طرح ان کے جھٹلانے والوں کو سزا دی ہے۔

جو تاریخی قصے اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ سبق آموز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ کا یہ اہم واقعہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ پاتے ہی اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس میں صوفیاء، کفار قریش ہی کے لیے سبق نہ تھا جو حضرت ابراہیم کے ساتھ اپنے نبی تعلق پر فخر کرتے پھرتے تھے، بلکہ ان مسلمانوں کے لیے بھی سبق تھا جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے تھے۔ یہ واقعہ سن کر انہیں بتا دیا گیا کہ اسلام کی حقیقت اور اس کی اصلی روح کیا ہے، اور اسے اپنا دین بنالینے کے بعد ایک مومن صادق کو کس طرح اللہ کے رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

سورہ کی آخری آیات محض آغاز کے لیے تنبیہ ہی نہ تھیں بلکہ اُن اہل ایمان کے لیے بشارت بھی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت میں انتہائی حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہیں یہ آیات سنا کر خوشخبری دے دی گئی کہ آغازِ کار میں جن مصائب سے انہیں سابقہ پیش آرہا ہے اُن پر نگہرائیں نہیں، آخر کار غلبہ انہی کو نصیب ہوگا، اور بالکل کے وہ علمبردار جو اس وقت غالب نظر آ رہے ہیں، انہی کے ہاتھوں مغلوب و مفتوح ہو کر رہیں گے۔ چند ہی سال بعد واقعات نے بتا دیا کہ یہ محض خالی خولی قسلی نہ تھی بلکہ ایک ہونے والا واقعہ تھا جس کی پیشگی خبر دے کر ان کے دل مضبوط کیے گئے تھے۔

اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے

قطارِ وقطار صفت باندھنے والوں کی قسم، پھر اُن کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں، پھر اُن کی قسم جو کلامِ نصیحت سنانے والے ہیں، تمہارا معبود حقیقی کس ایک ہی ہے۔ وہ جو زمین سے مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ان میوں گروہوں سے مراد فرشتوں کے گروہ ہیں۔ اور یہی تفسیر حضرات عبد اللہ بن مسعود، ابن عباس، قتادہ، مسروق، سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، سدی، ابن زید، اور بیہ بن انس سے منقول ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی دوسری تفسیر بھی کی ہے، اگر موقعِ محل سے یہی تفسیر زیادہ مناسب رکھتی نظر آتی ہے۔

اس میں قطارِ وقطار صفت باندھنے کا اشارہ اس طرف ہے کہ تمام فرشتے جو نظامِ کائنات کی تدبیر کر رہے ہیں، اللہ کے بندے اور غلام ہیں، اس کی اطاعت و بندگی میں صف بستہ ہیں اور اس کے فرامین کی تعمیل کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔ اس مضمون کا اعادہ آگے چل کر پھر آیت ۱۶۵ میں کیا گیا ہے جس میں فرشتے خود اپنے متعلق کہتے ہیں: **لَا تَحِثُّ الْوَعْدُ**

”ڈانٹنے اور پھٹکارنے“ سے مراد، جیسا کہ بعض مفسرین سے سمجھا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ فرشتے ہیں جو بڑوں کو ہانکتے اور بارش کا انتظام کرتے ہیں۔ لیکن آگے کے مضمون سے جو مفہوم زیادہ مناسب رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ انہی فرشتوں میں سے ایک گروہ وہ بھی ہے جو نافرمانوں اور مجرموں کو پھٹکا رہا ہے اور اس کی یہ پھٹکار بدونِ نقیہ ہی نہیں ہوتی بلکہ

اور آسمانوں کا اور تمام اُن چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں، اور سارے مشرقوں کا مالک۔
انسانوں پر وہ حوادث طبعی اور آفات تاریخی کی شکل میں برستی ہے۔

”کلام نصیحت سننے سے مراد یہ ہے کہ اپنی فرشتوں میں وہ بھی ہیں جو امر حق کی طرف توجہ دلانے کے لیے تذکیر کی خدمت انجام دیتے ہیں، حوادث زمانہ کی شکل میں بھی جن سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کرتے ہیں اور اُن نصیحت کی صورت میں بھی جو اُن کے ذریعہ سے انبیاء پر نازل ہوتی ہیں، اور اُن الہامات کی صورت میں بھی جو اُن کے واسطے سے نیک انسانوں پر ہوتے ہیں۔

۳۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر مذکورہ صفات کے حامل فرشتوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ پورا نظام کائنات جو اللہ کی بندگی میں چل رہا ہے، اور اس کائنات کے وہ سارے مظاہر جو اللہ کی بندگی سے اخراج کرنے کے برے نتائج انسانوں کے سامنے لاتے ہیں، اور اس کائنات کے اندر یہ نظام کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک پے درپے ایک ہی حقیقت کی یاد دہانی مختلف طریقوں سے کرائی جا رہی ہے، یہ سب چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ انسانوں کا ”الہ“ صرف ایک ہی ہے۔

”الہ“ کے لفظ کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ معبود جس کی بالفعل بندگی و عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرے وہ معبود جو فی الحقیقت اس کا مستحق ہو کہ اس کی بندگی و عبادت کی جائے یہاں الہ کا لفظ دوسرے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے معنی میں تو انسانوں نے دوسرے بہت سے الہ بنا رکھے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے ”الہ“ کا ترجمہ ”معبود حقیقی“ کیا ہے۔

۴۔ سورج ہمیشہ ایک ہی مطلع سے نہیں نکلتا بلکہ ہر روز ایک نئے زاویے سے طلوع ہوتا ہے۔ نیز ساری زمین پر وہ بیک وقت طالع نہیں ہو جاتا بلکہ زمین کے مختلف حصوں پر مختلف اوقات میں اس کا طلوع ہوا کرتا ہے۔ ان وجوہ سے مشرق کبے بجائے مشارق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ مغارب کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ مشارق کا لفظ خود ہی مغارب پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم ایک جگہ رب المشارق و المغرب کے الفاظ بھی آئے ہیں (المعارج ص ۳۳)۔
۵۔ ان آیات میں جو حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا مالک و فرمانروا ہی انسانوں کا اعلیٰ معبود ہے، اور وہی درحقیقت معبود ہو سکتا ہے، اور اسی کو معبود مہنا چاہیے۔ یہ بات ہر امر عقل کے خلاف ہے

ہم نے آسمانِ نیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ شیاطین غلامِ اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے، ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے ہم عذاب کہ لب (یعنی مالک اور محکم اور مربی و پروردگار) کوئی ہو اور اللہ (عبادت کا مستحق) کوئی اور ہو جائے۔ عبادت کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ آدمی کا نفع و ضرر اس کی حاجتوں اور ضرورتوں کا پورا ہونا، اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا، بلکہ بجائے خود اس کا وجود و بقا ہی جس کے اختیار میں ہے، اس کی بالائری تسلیم کرنا اور اس کے آگے جھکنا آدمی کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ اس وجہ کو آدمی سمجھ سکے تو خود بخود اس کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ اختیارات والے کی عبادت نہ کرنا اور بے اختیار کی عبادت کرنا، دونوں صریح خلاف عقل و فطرت ہیں۔ عبادت کا استحقاق پہنچتا ہی اس کو ہے جو اقتدار رکھتا ہے۔ ہمیں بے اقتدار مستبیاں تو وہ نہ اس کی مستحق ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے، اور نہ ان کی عبادت کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے کا کچھ حاصل ہے، کیونکہ ہماری کسی درخواست پر کوئی کارروائی کرنا سرے سے ان کے اختیار میں ہی نہیں۔ ان کے عاجزی و نیاز منگی کے ساتھ جھکنا اور ان دعا مانگنا بالکل ویسا ہی افتخارِ فعل ہے جیسے کوئی شخص کسی حکم کے سامنے جھٹکے اور اس کے حضور درخواست پیش کرنے کے بجائے جو دو سر سائیں وہاں درخواستیں لیے کھڑے ہوں انہی میں کسی کے ساتھ جھٹکا کر کھڑا ہو جائے۔

۵۔ آسمانِ دنیا سے مراد قریب کا آسمان ہے، جس کا مشاہدہ کسی دوربین کی مدد کے بغیر ہم برہنہ آنکھ سے کرتے ہیں۔ اس کے آگے جو عالم مختلف طاقتوں کی دوربینوں سے نظر آتے ہیں، اور جن عالموں تک ابھی ہمارے وسائل مشاہدہ کی رسائی نہیں ہوئی ہے، وہ سب دُور کے آسمان ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ سمار کسی متعین چیز کا نام نہیں ہے بلکہ قدیم ترین زمانے سے آج تک انسان بالعموم یہ لفظ اور اس کے ہم معنی الفاظ عالم بالا کے لیے استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔

۶۔ یعنی یہ عالم بالاحضِ خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے، بلکہ اس کی بندش ایسی مضبوط ہے، اور اس کے مختلف خطے ایسی متحکم سرحدوں سے محصور کیے گئے ہیں کہ کسی شیطان سرکش کا ان حدود سے گزر جانا ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے ہر مارے اور سیارے کا اپنا ایک دائرہ اور کُرہ (SPHERE) ہے جس کے اندر سے کسی کا نکلنا بھی سخت دشوار ہے اور جس میں باہر سے کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھے تو غلامے محض کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن

ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا بچھا کرتا ہے۔

حقیقت میں اس خدا کے اندر بے حد و حساب خطے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کیے گئے ہیں جن کے مقابلے میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان گونا گوں مشکلات سے کیا جاسکتا ہے جو زمین کے رہنے والے انسان کو اپنے قریب ترین ہمسائے، چاند تک پہنچنے میں پیش آرہی ہیں۔ ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق یعنی جنوں کے لیے بھی عالم بالا کی طرف معبود کرنے میں مانع ہیں۔

۷۔ اس مضمون کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اُس وقت عرب میں کہانت کا بڑا چرچا تھا جبکہ جگہ جگہ کاہن بیٹھے پیشین گوئیاں کر رہے تھے، غیب کی خبریں دے رہے تھے، گم شدہ چیزوں کے پتے بتا رہے تھے، اور لوگ اپنے اگلے پچھلے حال دریافت کرنے کے لیے ان سے رجوع کر رہے تھے۔ ان کاہنوں کا دعویٰ یہ تھا کہ جن اور شیاطین ان کے قبضے میں ہیں اور وہ انہیں ہر طرح کی خبریں لالا کر دیتے ہیں۔ اس ماحول میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منصب نبوت پر مرفراز ہوئے اور آپ نے قرآن مجید کی آیات سنانی شروع کیں جن میں پچھلی تاریخ اور آئندہ پیش آنے والے حالات کی خبریں دی گئی تھیں، اور ساتھ ساتھ آپ نے یہ بھی بتایا کہ ایک فرشتہ یہ آیات میرے پاس لاتا ہے، تو آپ کے مخالفین نے فوراً آپ کے اوپر کاہن کی بھتی کس دی اور لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ ان کا تعلق بھی دوسرے کاہنوں کی طرح کسی شیطان سے ہے جو عالم بالا سے کچھ سُن گئے کہ ان کے پاس آجاتا ہے اور یہ اُسے وحی الہی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس الزام کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ارشاد فرما رہا ہے کہ شیاطین کی تو رسائی ہی عالم بالا تک نہیں ہو سکتی۔ وہ اس پر قادر نہیں ہیں کہ ملاء اعلیٰ (یعنی گروہ ملائکہ) کی باتیں سن سکیں اور لاکر کسی کو خبریں دے سکیں۔ اور اگر اتفاقاً کوئی ذرا سی بھٹک کسی شیطان کے کان میں پڑ جاتی ہے تو قبل اس کے کہ وہ اسے لیکر نیچے آئے، ایک تیز شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے ذریعے سے کائنات کا جو عظیم الشان نظام چل رہا ہے وہ شیاطین کی دس اندازی سے پوری طرح محفوظ ہے اس میں دخل دینا تو درکنار اس کی معلومات حاصل کرنا بھی ان کے بس میں نہیں ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، صفحہ ۵۰۔

اب ان سے پوچھو، ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا ان چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟ ان کو تو ہم نے میس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔ تم (اللہ کی قدرت کے کوششوں پر) حیران ہو اور یہ یہ کفار مکہ کے اُس شبہ کا جواب ہے جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوتے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے جواب میں امکانِ آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اُن کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک مرے ہوتے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمہارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان، اور یہ بے شمار اشیاء جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، ان کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جس خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کر چکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے۔

یعنی یہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے۔ مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اسی مٹی سے بنایا جاسکتا ہے۔ میس دار گارے سے انسان کی پیدائش کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اول کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی اور پھر آگے نسلِ انسانی اسی پہلے انسان کے نطفے سے وجود میں آئی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر انسان میس دار گارے سے بنا ہے۔ اس لیے کہ انسان کا سارا مادہ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا سے بنتا ہے، اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزاء سے مرکب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخر کار اس کا مادہ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور اُن حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔ پس بنائے استدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کیسے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمہارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اسی مٹی سے تمہاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہوگی؟

یہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو صریح جادوہنٹے، بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جاتیں اور ہڈیوں کا پتھر رہ جائیں اُس وقت ہم پھر زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباؤ اجداد بھی اٹھاتے جائیں گے؟ ان سے کہو ہاں اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو۔

بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکا یک یہ اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے، دیکھ رہے ہونگے۔ اُس وقت یہ کہیں گے ہاتے ہماری کم بختی، یہ تو یوم الجزا ہے۔ یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے یہ حکم ہوگا، گھیر لاؤ سب ظالموں کو اور ان کے

نلہ یعنی عالم طلبات کی باتیں ہیں۔ کوئی جادو کی دنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے، جس میں مڑے اٹھیں گے، عذالت ہوگی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہونگے۔ یا پھر یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا۔

اللہ یعنی اللہ جو کچھ بھی تمہیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ جب اس نے چاہا اُس کے ایک اشارے پر تم وجود میں آ گئے۔ جب وہ چاہے گا اس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے۔ اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمہیں اٹھا کھڑا کرے گا۔

اللہ یعنی جب یہ بات ہونے کا وقت آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کر دینا کوئی بڑا لمبا چڑا کام نہ ہوگا۔ بس ایک ہی جھڑکی سونوں کو جگا اٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔ جھڑکی کا نقطہ یہاں بہت معنی خیز ہے اس باعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ لگا ہوں گے سامنے آئے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوتے پڑے ہیں، یکا یک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے ”اٹھ جاؤ“ اور بس ان کی آن میں وہ سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

اللہ ہو سکتا ہے کہ یہ بات اُن سے اہل ایمان کہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ فرشتوں کا قول ہو، ہو سکتا ہے کہ میدانِ